بیل کبھی منڈھے نہ چڑھنے دی - تا آنکہ ایک روز مجبوراً مولوی صاحب سے ملنے کا موقع پیدا ہوگیا لیکن اسے ہماری خوش بختی کہیے یا بدنصیبی کہ قلعے کے آہنی پھاٹک تک تو ہم پہنچے لیکن اندر جھانکے بغیر واپس پلٹ آئے -

ہوا یوں کہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں پاکستان اورینٹل کانفرنس میں ایک ادنیٰ کارکن (آفس سیکرٹری) کی حیثیت سے مجھے بھی کچھ کام کرنے کا اتفاق ہوا - یونیورسٹی ہال میں کانفرنس کے افتتاحی اجلاس کے بعد قدرے وقفے سے یہیں مجلس مضامین کا جلسہ ہوا - اس وقت مولوی صاحب کی خدمت میں ایک زبانی پیغام پہنچانے کا کام استاذی ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے میرے سپرد کیا - پہلے تو میں بڑا سراسیمہ ہوا کہ یہ مشن خاصا ٹیڑھا تھا - پھر حواس جمع کیے اور جی کڑا کرکے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے اور پیغام پہنچانے کے لیے روانہ ہوا - لیکن اس طرح کہ ایک ایک قدم سو سو من کا ہو رہا تھا - یونیورسٹی ہال کے باہر چمن میں مولوی صاحب دھوپ میں سستانے کے لیے اکیلے بیٹھے تھے - میں ڈرتے ڈرتے ذرا ان کے قریب پہنچا اور پھر علیک سلیک کے بعد جو پیغام پہنچانا تھا ہکلاتے ہکلاتے وہ عرض کیا - جواب میں ایک لمبی گونجدار ''ہوں'' کا غبارہ چھوٹا ، اور پھر نظریں اٹھاتے ہوئے یہ استفسار ہوا ''تم کون ہو ؟'' اس ''تم کون ہو'' کا دھکا کچھ اس زور کا لگا کہ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھال کر عرض کر سکا ''جی ، میں ایک طالب علم ہوں اور اس کانفرنس میں ایک خادم کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں''—''اچھا'' یہ لفظ ذرا دھیمے سر میں کہا گیا جو میرے لیے رہائی کا پروانہ ثابت ہوا - میں وہاں سے کھسکا اور مولوی صاحب بدستور اپنے خیالات میں گم ہوگئے -

اس واقعے کے بعد ایک دو بار سید صاحب کے ساتھ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا - سید صاحب تو کچھ علمی اور تنظیمی امور کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے رہتے اور میں خاموشی اور تحیر کے عالم میں گم رہتا - اور پھر ایک دفعہ ہم نے ' سید صاحب نے زیادہ اور میں نے کم ، ایک منصوبے کے تحت مولوی صاحب کے گھر پر آن سے ملنے کا پروگرام بنایا - اس زمانے میں ڈاکٹر سید عبداللہ ''ارمغان علمی'' مرتب کرکے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کر چکے تھے اور ان کے حوصلے کچھ بڑھے ہوئے تھے - خیر ، راستہ بھر دل میں اظہار مدعا کے مسودے سوچتے جاتے تھے اور کبھی کبھی مشورہ بھی ہو جاتا تھا کہ بات کہاں سے شروع کی جائے اور مدعا کیسے بیان کیا جائے - جب لارنس روڈ سے گزر کر میسن روڈ پر پہنچے تو یہ سارے مسودے ذہن سے محو ہونے لگے - مولوی صاحب کے بنگلے کے صحن میں داخل ہوکر اندر اطلاع بھجوائی تو مولوی صاحب کے چھوٹے صاحبزادے مصطفیٰ باہر آئے اور ہمیں

ڈرائنگ روم میں بٹھا کر مولوی صاحب کو اطلاع کرنے اندر چلے گئے - پھر کچھ دیر بعد آئے اور ہمیں ساتھ لے کر مکان کے اندر پائیں باغ کی طرف لے گئے وہاں ایک چبوترے پر چند کرسیاں پڑی تھیں اور تپائیوں پر بڑی بڑی حجم کی کتابوں کا انبار اور فائلوں اور مسودوں کے گٹھے پڑے تھے - درمیان میں مولوی صاحب شلوار قمیض پہنے ، سر پر ایک چھوٹا سا تولیہ رکھے تشریف فرما تھے - ایک طرف ایک بڑا سا پنجرہ تھا جس میں رنگ برنگی خوبصورت چڑیاں چہچہا رہی تھیں ، اور اپنے سریلے اور سامع نواز نغموں سے شاید مولوی صاحب کو محظوظ کر رہی تھیں - یہ گویا مولوی صاحب کا چڑیا گھر تھا - بڑا پرسکون اور لطیف ماحول تھا - مولوی صاحب نے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا - ہم ایک دوسرے کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کرسیوں پر بیٹھ گئے - مصطفیٰ صاحب ایک طرف کھڑے رہے - مولوی صاحب ایک مضمون کا مسودہ دیکھ رہے تھے - اسے ایک طرف کرکے آنے کا سبب پوچھا - ادھر یہ صورت ہو رہی تھی کہ دل دانا کے سارے مسودے فراموش ہو چکے تھے اور حرف مدعا زبان پر آنے سے ہچکچا رہا تھا - ہاں یہ بتانا میں بھول گیا کہ جب ہم ڈرائنگ روم سے اٹھ کر پائیں باغ کی طرف آ رہے تھے تو سید صاحب نے مصطفیٰ سے پوچھا تھا کہ ”مولوی صاحب کا ڈائننگ روم کس طرف ہے ؟ ڈرائنگ روم تو کئی بار پہلے بھی دیکھا ہے - ڈائننگ روم دیکھنے کی حسرت باقی ہے۔“ مصطفیٰ صاحب اس پر مسکرا کر خاموش ہو رہے تھے - اب مولوی صاحب کے استفسار پر سید صاحب بھی زیر لب متبسم تھے اور مصطفیٰ بھی ، اور میں ان دونوں کی طرف دیکھ کر حیرت زدہ ہو رہا تھا - خیر ، جب حرف مدعا نے ساتھ نہ دیا تو عافیت اسی میں سمجھی گئی کہ گفتگو کسی علمی موضوع پر شروع کر دی جائے - چنانچہ سید صاحب نے تخلص کے آرٹیکل پر ، جو ان دنوں وہ دائرۂ معارف کے لیے لکھ رہے تھے ، بات چیت شروع کی - پھر درمیان میں کچھ گریز کی طرف آتے ہوئے ڈائننگ روم اور کچھ کھانے پینے اور دعوت وغیرہ کا تذکرہ بھی کر دیا - یہ حسن طلب اگرچہ کچھ گریز پا اور مبہم سا تھا ، تاہم مولوی صاحب نے کچھ محسوس کرتے ہوئے اور گھنی مونچھوں کے پیچھے قدرے مسکراتے ہوئے کہا ”سید ہر وقت میلے کرتے رہتے ہو ، کچھ کام کیا کرو - ان لڑکوں کو بھی کام پر لگاؤ!“ یہ نصیحت ان کا معمول تھی - ”میلوں“ سے مراد کانفرنسیں اور جلسے تھے جو ان دنوں اورینٹل کالج میں اکثر ہوتے رہتے تھے اور اس زمانے میں ان کی ضرورت بھی تھی - لیکن مولوی صاحب کو خاموشی اور مستقل مزاجی سے علمی کام کرتے رہنا پسند تھا - خیر ، ڈائننگ روم اور دعوت کے ذکر پر مولوی صاحب بڑی صفائی سے طرح دے گئے - مصطفیٰ زیر لب مسکرا رہے تھے - سید صاحب کا وار خطا جا رہا تھا اور میں اس ناتمام چاند ماری کے تماشے کو دیکھ کر عبرت پکڑ رہا تھا - آخر مولوی صاحب نے اپنے بیٹے سے

کہا ''مصطفیٰ ، جاؤ شربت لاؤ'' (وہ مصطفیٰ بہ یائے مجہول پکارتے تھے) مصطفیٰ گئے اور تھوڑی دیر کے بعد مینگو سکوائش کے دو گلاس لے آئے ۔ سید صاحب تو اسی کو غنیمت سمجھ کر نوش فرمانے لگے ، میں نے گلاس منہ کو لگایا تو ذائقہ ترش تھا ۔ غالباً میٹھا نہیں ڈالا گیا تھا ۔ مجھے اس روز نزلے کی شکایت تھی ، اس لیے چکھ کر گلاس ٹرے میں رکھ دیا ۔ مولوی صاحب نے دیکھا تو پوچھا ''پیتے کیوں نہیں'' ، میں تو چپ رہا ، سید صاحب نے یہ کہہ کر میری گلو خلاصی کرائی کہ ''اسے نزلے کی شکایت ہے''۔ مولوی صاحب نے طبی نقطہ نظر سے نزلے میں ترشی وغیرہ سے پرہیز کے فوائد پر کچھ روشنی ڈالی اور بات ختم ہوگئی ۔

کچھ عرصے کے بعد میری آزمائش کا مرحلہ بھی آیا ۔ جب ۱۹۵۹ء میں مجھے اورینٹل کالج کے شعبہ اردو میں بطور عارضی لیکچرار لیا گیا تو اس زمانے میں مولوی صاحب ڈین آف اورینٹل فیکلٹی تھے ۔ ضابطے کے مطابق انھوں نے میرا انٹرویو لینا تھا اور پھر میری تعیناتی کی توثیق ہونی تھی ۔ کالج میں ٹیلی فون پر دو تین بار پیغام آئے کہ میں مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں ۔ یہ واقعی بڑے دل گردے کا کام تھا اور میں قدرے خائف تھا ۔ لیکن کب تک ، آخر ایک روز جی کڑا کرکے حاضر خدمت ہوا ۔ مولوی صاحب دائرۂ معارف اسلامیہ کے ایک گوشے میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں تشریف فرما تھے ۔ ان کا سٹینو عطا محمد میری چٹ لے کر اندر گیا اور میں ابھی دل کو سمجھا بجھا کر مضبوط بنا ہی رہا تھا کہ بلاوا آ گیا ۔ اندر گیا ۔ مولوی صاحب نے اپنے قریب سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا ۔ میں سخت مرعوب اور کچھ حواس باختہ بھی تھا ۔ بیٹھنے کا اشارہ پایا تو قدرے تسلی ہوئی ۔ مولوی صاحب نے حسب نسب کے بارے میں پوچھنا شروع کیا اور میں نے دھیرے دھیرے ان کے سوالوں کے جواب دینے شروع کیے ۔ بات سے بات پیدا ہوتی گئی۔ احوال و کوائف کے بعد مطالعہ و تحقیق کے بارے میں سوالات ہوئے اور انٹرویو طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا ۔ سراسیمگی کا پہلا مرحلہ گزرنے کے بعد میں ذرا خود اعتمادی سے گفتگو کرنے لگا تھا ۔ میری زندگی کا یہ سخت ترین انٹرویو تھا ، لیکن میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب کا باضابطہ رعب دار لہجہ بھی آہستہ آہستہ نرمی اور شیریں کلامی میں تحلیل ہونے لگا تھا ۔ آدھ گھنٹے کی بات چیت کے بعد میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی بے تکلف ماحول میں بیٹھا گفتگو کر رہا ہوں ۔ مولوی صاحب کے مشفقانہ جذبات ، ان کی ضابطہ پسند سخت گیر طبیعت پر غالب آ چکے تھے اور مجھے اس پرہیبت شخصیت کی بیرونی سنگلاخ دیواروں کے روزنوں میں سے محبت اور شفقت کے گل و گلزار کی ایک جھلک صاف نظر آ رہی تھی۔ تاہم یہ ایک ضابطے کا انٹرویو تھا ، اس لیے یہ جھلک بھی عارضی تھی ۔

اپنا تو یہ حال ہوا ۔ اگلے برس ملک ذوالفقار علی شعبہ عربی کے ایڈہاک ایکچرار کی حیثیت سے کالج میں آ گئے ۔ ان کے انٹرویو کی بابت تو مجھے کچھ علم نہیں کہ کیسا ہوا ، لیکن ایک واقعہ اس زمانے کا یاد ہے ۔ مولوی صاحب نے اپنی ایک کتاب کسی حوالے کے سلسلے میں ملک صاحب کو دی تھی ۔ چند روز کے بعد ملک صاحب یہ کتاب مولوی صاحب کے سٹینو عطا محمد کے حوالے کر آئے ۔ تھوڑی دیر کے بعد سید صاحب کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی ۔ رسیور اٹھایا گیا تو دوسری طرف مولوی صاحب غضبناک لہجے میں بول رہے تھے ۔ ’’سید ، وہ لڑکا کہاں ہے ؟‘‘

’’جی ۔ کون سا لڑکا‘‘۔

’’وہی نا ، جسے تم ایک روز میرے پاس لائے تھے‘‘۔

’’اچھا ! وہ ، ذوالفقار علی‘‘۔

’’ہاں ، وہی سید ! تم بھی کالج میں کیسے کیسے لوگ اکٹھے کر رہے ہو جنھیں کتاب پکڑنے کا سلیقہ نہیں آتا‘‘۔

سید صاحب کچھ نہ سمجھ کر ، ’’جی کیا ! ہوا کیا ؟‘‘

’’ہونا کیا ہے ، وہ لڑکا میری کتاب لے گیا تھا ، اب واپس آئی ہے تو اس کی جلد خراب ہے‘‘۔

ہوا یہ تھا کہ ملک صاحب کے ہاتھ جو مولوی صاحب کی کتاب لگی تو کہیں شرق پور آتے جاتے راستے میں بے احتیاطی سے پسینے والے ہاتھ کتاب کو لگا بیٹھے۔ گرد پوش خراب ہوگیا ۔ مولوی صاحب اس پر برافروختہ تھے ۔ سید صاحب نے اسی وقت ملک ذوالفقار علی کو بلایا اور انھیں اس نازک صورت حال سے آگاہ کیا ۔ مولوی صاحب کی خفگی کا حال سن کر ملک صاحب کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے ۔ سید صاحب نے ذرا ڈھارس بندھائی اور انھیں مولوی صاحب کے پاس معذرت کے لیے بھیجا ۔ اب معلوم نہیں ملک صاحب وہاں گئے یا نہیں ، معذرت کی یا نہیں کی ۔ معذرت کی تو کیا ہوا ؟ یہ ان کہی کہانی ہے ۔ ملک صاحب ہمیں اور تو سب کچھ بتا دیتے رہے ہیں لیکن ایک یہی کہانی انھوں نے ہم سے چھپائے رکھی ہے !

ایک دو سال کے بعد جب میں اورینٹل کالج کی تاریخ لکھ رہا تھا تو اس زمانے میں اورینٹل کالج کی زندہ تاریخ یعنی مولوی صاحب سے ملنے کے بہت سے موقعے ملے۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ' عطا محمد کے ہاتھ چٹ بھیجتا ۔ فوراً بلا لیتے ، پاس بٹھاتے ، اپنا کام چھوڑ کر دیر تک گزرے زمانے کی باتیں کرتے رہتے ۔ جو کچھ میں پوچھتا اس کی وضاحت فرماتے ۔ اس طرح کالج کے بارے میں اور خود ان سے متعلق بہت سی باتیں انھی کی زبانی سنیں ۔ انھوں نے اپنی لاہور میں

پہلی بار آمد کا واقعہ بڑی تفصیل سے سنایا ۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرکے وہ پہلی بار ۱۹۰۰ء میں اپنے والد محترم کے ساتھ اسلامیہ کالج میں داخلے کے لیے قصور سے لاہور آئے تھے ۔ لاہور کے تاریخی مقامات کو دیکھ کر ان کے ذہن پر اسلاف کی عظمت کے گہرے نقوش ثبت ہوئے ۔ پھر اسی لاہور میں انھوں نے باغ بیرون دلی دروازہ و شیرانوالہ کے درمیان مولوی محمد حسین آزاد کو بھی حالت جنون میں گھومتے پھرتے دیکھا ۔ ان کے معصوم ذہن پر آثار سلف کے جو ابتدائی نقوش ثبت ہوئے انھی کی باز گشت ہمیں مولوی صاحب کی آئندہ علمی تحقیقات میں ملتی ہے ، جب وہ نوادر کی تلاش اور اسلاف کے علمی کارناموں کی تدوین میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے ہیں ۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب مولوی صاحب کیمبرج سے آ کر پنجاب یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر بنے تو انھوں نے عربی زبان و ادب اور اسلامی تاریخ کے لیے کام شروع کیا ۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی لائبریری کے اورینٹل سیکشن کی تعمیر میں انھوں نے جو انتھک کام کیا اس کی مثال شاید ہمیں اور کہیں نہ ملے ۔ مولوی صاحب نے اس جد و جہد کی بعض تفصیلات بڑے مزے لے لے کر سنائیں ۔ اس زمانے میں یونیورسٹی نے کثیر رقوم نادر قلمی و مطبوعہ کتابوں کی خرید کے لیے پروفیسروں کی صوابدید پر وقف کر رکھی تھیں ۔ مولوی صاحب نے نجی کتب خانوں سے نادر مخطوطات حاصل کرنے کے لیے ملک کے بعید گوشوں تک متعدد سفر کیے ۔ اس زمانے کے سفروں کی ماہیت ، سفر و حضر کے مشاغل ، خصوصاً رمضان المبارک کے دنوں میں ویران اسٹیشنوں کے سنسان ریسٹ ہاؤسوں میں سحر و افطار کی کیفیات ۔ یہ سب باتیں مولوی صاحب اس طرح بیان کرتے جیسے ابھی ابھی وہ سفر کرکے آ رہے ہوں ۔ ان واقعات سے جہاں ان کی سخت کوشی کا اظہار ہوتا ، وہاں ان کے دینی جذبے کا بھی احساس ہوتا ۔ مولوی صاحب کی صحت بڑھاپے میں بھی قابل رشک رہی ۔ اگرچہ انسائیکلوپیڈیا کے پرمشقت ہمہ وقتی کام نے (جو دفتر اور گھر دونوں جگہ ہوتا) جسمانی طور پر انھیں خاصا متاثر کیا لیکن پھر بھی وہ جوانوں سے زیادہ تندرست نظر آتے ۔ مولوی صاحب کی صحت کا راز جہاں ان کی متوازن خوراک میں تھا وہاں ان کے مشاغل حیات کا عمل دخل بھی کچھ کم نہ تھا ۔ مولوی صاحب چائے اور سگریٹ وغیرہ سے ہمیشہ دور رہے ۔ اپنا کام بڑے انہاک اور لگن سے کیا ۔ وہ متدین تھے ۔ بچپن سے صوم و صلوٰۃ کے پابند ، ہنگامۂ شباب میں بھی ان کا کردار بے داغ رہا اور یہی ان کی صحت اور تندرستی کا بڑا راز تھا ۔

مولوی صاحب میرے کام سے گہری دلچسپی لے رہے تھے ، لیکن اتنا میں سمجھ گیا تھا کہ انھیں سرسری کام یا محض باتوں سے متاثر نہیں کیا جا سکتا ۔ وہ کسی ٹھوس علمی تحقیقات ہی سے قائل کیے جا سکتے تھے ۔ اورینٹل کالج کی تاریخ کے سلسلے میں ایک روز مسز سٹریٹن کی تالیف Letters from India,

with Memoirs دیکھ رہا تھا جو اس خاتون نے اپنے مرحوم شوہر کے خطوط اور یادداشتوں سے مرتب کی تھی ۔ ڈاکٹر سٹریٹن ۱۸۹۹ء سے ۱۹۰۲ء تک تین سال اوریئنٹل کالج کے پرنسپل رہے اور ۲۳ اگست ۱۹۰۲ء کو گلمرگ (کشمیر) میں ان کا انتقال ہوا تھا ۔ مسز سٹریٹن کی مرتبہ تالیف میں کچھ تصاویر بھی تھیں جن میں اوریئنٹل کالج کے اساتذہ کا ایک گروپ فوٹو تھا ۔ اس گروپ میں اساتذہ کے درمیان ڈاکٹر سٹریٹن اور پروفیسر طامس آرنلڈ موجود تھے ۔ پس منظر حضوری باغ لاہور کی بارہ دری کا تھا ۔ اس زمانے میں شاہی مسجد کے حضوری باغ والے حجرے ، جہاں اب علما اکیڈمی کے دفاتر ہیں ، اوریئنٹل کالج کے ہاسٹل کا کام دے رہے تھے ۔ اتفاق سے اساتذہ کا ایک گروپ فوٹو مجھے کالج کے پرانے ریکارڈ میں ملا تھا جو ۱۹۰۳ء کا بنا ہوا تھا ۔ اس گروپ فوٹو میں پروفیسر طامس آرنلڈ کے ساتھ پروفیسر وولنر بیٹھے تھے جو اسی سال اپریل میں کالج کے پرلسپل ہو کر آئے تھے ۔ یہ گروپ فوٹو پروفیسر وولنر کی آمد اور طامس آرنلڈ (قائم مقام پرنسپل) کی سبکدوشی کے موقع پر کالج کے اساتذہ کے ہمراہ حضوری باغ میں اتارا گیا تھا ۔ کچھ دیر تک تو کتاب والی تصویر اور اس گروپ فوٹو نے مجھے حیرت زدہ کیے رکھا ۔ کیونکہ سوائے پروفیسر وولنر اور ڈاکٹر سٹریٹن کی تبدیلی کے اور ہر چیز میں یکسانی تھی ۔ پس منظر بھی وہی تھا ۔ اساتذہ کی ترتیب نشست بھی وہی تھی ۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد یہ معمہ حل ہو گیا ۔

مسز سٹریٹن نے اپنے مرحوم شوھر کے خطوط جو اس نے اپنے زمانۂ قیام لاہور میں اپنے وطن میں مختلف عزیزوں کے نام لکھے تھے ، مع یادداشتوں کے ۱۹۰۸ء میں لندن سے طبع کروائے ۔ اس موقع پر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اس تالیف میں سمجھنا ایک ایسا گروپ فوٹو بھی ہونا چاہیے جس میں ڈاکٹر سٹریٹن مرحوم مع اساتذہ کے موجود ہیں ، لیکن ایسا کوئی گروپ فوٹو موجود نہیں تھا ۔ آخر اس کی ایک ہی صورت ممکن نظر آئی اور وہ یہ کہ اپریل ۱۹۰۳ء میں اترنے والے گروپ فوٹو میں وولنر کی بجائے سٹریٹن کو بٹھا دیا جائے جن کا انتقال اگست ۱۹۰۲ء میں ہو چکا تھا۔ انگلستان کے فن کار اس کام کے ماہر تھے۔ چنانچہ یہ کام بڑی چابکدستی سے کیا گیا اور اس طرح ایک ہی گروپ کی دو تصویریں بن گئیں جنھیں بادی النظر میں ایک کہنا دشوار تھا ۔ یہ جعلسازی مجھے تو کچھ بڑی معصومانہ اور پیاری سی لگی*۔ اگلے روز اس کا ذکر مولوی صاحب سے ہوا ۔ وہ انگریزوں کے بارے میں کچھ زیادہ ہی خوش اعتقاد تھے ۔ انھیں میری بات کا شاید اعتبار نہ آیا ۔ میں نے کتاب والی جعلی تصویر اور اصلی تصویر دونوں ان کے سامنے رکھ دیں ۔ وہ دیر تک دونوں تصویروں کو مختلف زاویوں سے دیکھتے رہے اور آخر انھوں نے بھی میری بات کی تائید کر دی ۔ دیر تک مسکراتے رہے اور مسز سٹریٹن کی ذہانت کی

---

* کیونکہ مقصد برا نہیں تھا ۔

داد دیتے رہے۔ کتاب والی تصویر میں کچھ اساتذہ کے نام جو مسز سٹریٹن کو معلوم تھے دے دیے گئے تھے۔ اصل گروپ فوٹو کے نیچے ناموں کا اندراج نہیں تھا۔ چند اساتذہ کے نام مولوی صاحب نے غور کر کے اور پہچان کر بتائے۔ چنانچہ کالج کی تاریخ میں میں نے ان دونوں مآخذ کو ملا کر اساتذہ کرام کے نام درج کر دیے۔ صرف چند نام ایسے رہ گئے جن کی نشاندہی نہ ہو سکی۔

اس روز دیر تک مولوی صاحب کے حضور نشست رہی۔ بے تکلفی سے باتیں ہوتی رہیں اور میں اپنی جگہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ آج ''آہنی دروازوں اور سنگین دیواروں والے قلعے'' کے سب پھاٹک کھل گئے ہیں اور میں اس قلعے کے وسیع اور دلکش مرغزاروں کی سیر کر رہا ہوں۔

تاریخ چھپ کر آئی تو میں اس کا ایک نسخہ مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لے کر گیا۔ کتاب الٹ پلٹ کر دیکھی، چند تعریفی کلمات بھی کہے۔ دو تین روز کے بعد پھر ملا تو فرمانے لگے کہ تاریخ میں بعض معلومات نامکمل ہیں۔ میں نے ذرا وضاحت کی گزارش کی تو کہا ''اب دیکھو نا صفحہ ۱۵۶ پر (کتاب سے صفحہ نکال کر سامنے رکھتے ہوئے) یہ لکھا ہے کہ میں نے یکم جنوری ۱۹۲۰ء سے ۳۰ جون ۱۹۲۰ء تک پروفیسر وولنر کی جگہ قائم مقام پرنسپل کے فرائض سرانجام دیے اور ڈاکٹر وولنر کی وفات کے بعد جنوری ۱۹۳۶ء میں پرنسپل مقرر ہوا . . .'۔ حالانکہ میں نے فلاں فلاں سال بھی (سنہ گنواتے ہوئے) بحیثیت پرنسپل آفیشیٹ کیا تھا، اس کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا۔''

میں نے عرض کیا کہ یہ تاریخ ذرا جلدی میں اختصار کے ساتھ لکھی گئی ہے اور پھر وائس پرنسپل شپ کے ذکر کے بعد جزئیات کو بفرض اختصار چھوڑ دیا گیا۔ اب مفصل تاریخ لکھوں گا تو ان سب امور کا بھی ذکر کروں گا۔ فرمانے لگے: ''یہ سید عبداللہ بھی لڑکوں سے عجیب کام کرواتا ہے۔ بس عجلت اور اختصار میں سب کام خراب ہوتے ہیں۔ یہ کیا تحقیق ہوئی۔ تحقیق صبر آزما کام ہے، یہ نہیں کہ کاتا اور لے آئے۔ سید کو تو بس میلوں کی لگی ہوئی ہے۔ اوریئنٹل کالج میں بس میلے ہوتے رہتے ہیں، کام کون کرے گا''۔ مولوی صاحب ذرا جلال میں آ گئے تھے۔ میں خاموشی اور ندامت سے ان کی کڑوی کسیلی، لیکن سچی باتیں سنتا رہا، کچھ مایوسی بھی ہوئی۔ واپس آ کر سید صاحب سے سرسری سا تذکرہ کیا۔ وہ بھی اس زجر و توبیخ پر کچھ حیران، کچھ پریشان ہوئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اس کے بعد مولوی صاحب نے انسائیکلوپیڈیا کے لیے کچھ آرٹیکل لکھنے کو دیے۔ وہ لکھ کر پیش کیے اور قبول ہوئے۔ مولوی کریم الدین پانی پتی کا تذکرہ طبقات الشعراء ہند مولوی صاحب کے ایما پر ایڈٹ کرنا شروع کیا، جس کے لیے پیش رو فارسی

تذکروں کے علاوہ گارسیں دتاسی کی فرانسیسی میں تاریخ ادب ہندوی سے بھی کام لینا پڑا - اس کے لیے میں نے اپنی ایک فرانسیسی شاگرد اپنی ماتاں سے مدد لی، لیکن یہ کام مولوی صاحب کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا اور ابھی تک اس تذکرے کا مسودہ غیر مطبوعہ حالت میں پڑا ہے - صرف اس پر ایک تحقیقی مقالہ «صحیفہ» میں چھپا تھا، جس پر پاکستان اور بھارت کے محققین نے کچھ تحسین کی جو میرے لیے حوصلہ افزا تھی، لیکن مجھے اس سے کوئی خوشی نہ ہوئی، مجھے تو اس پر مولوی صاحب بہت یاد آئے - وہ زندہ ہوتے تو اس مضمون پر تنقید کرتے اور مجھے میری محنت کا صلہ مل جاتا - سچ یہ ہے کہ ان کی تنقید ہمارے لیے مشعل راہ تھی اور ان کا اطمینان ہمارے حوصلے بڑھاتا تھا . . . افسوس کہ مولوی صاحب سے بلاواسطہ استفادے کا یہ دور بہت ہی مختصر ثابت ہوا - ایک روز ۱۴ مارچ ۱۹۶۳ء کو حسب معمول علی الصباح کالج پہنچا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب ہم سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئے ہیں - ایک لحظے کے لیے ایسا محسوس ہوا کہ گرد و پیش کی ہر شے جیسے ساکن ہوگئی ہو - عصر کی نماز کے بعد فیروز پور روڈ اور جیل روڈ کے درمیانی قبرستان میں لحد میں اتارنے سے قبل مولوی صاحب کا آخری دیدار ہوا - سفید گھنی مونچھوں کے ارد گرد سرخی کے بجائے زردی کی تہہ تھی - چہرے پر وہی تمکنت اور وقار، لیکن ابدی سکوت کے ساتھ، کتنے ہی چہرے اس وقت اشکبار تھے - مولانا صلاح الدین احمد، میاں بشیر احمد، میاں محمد شریف، مولانا غلام رسول مہر، پروفیسر حمید احمد خان! یہ سب لوگ بھی مولوی صاحب کے پیچھے پیچھے نہ جانے کہاں چلے گئے کہ جن کے دیکھنے کو اب «آنکھیں ترستیاں» ہیں:

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

GHALIB CENTENARY PUBLICATIONS

(Ifadat-i-Ghalib) افادات غالب

A collection of Ghalib's three Urdu works, viz., Lata'f-i-Ghaybi 1865, Sualat-i-Abdul Karim 1865, and Tigh-i-Tiz 1867. This collection is a continuity of the linguistic controversy started by Ghalib in his book Qati' Burhan (Dirafsh-i-Kaviyani).

1969, 319 pp.

Edited by Syed Vazirul Hasan Abedi — Rs. 11.53

(Ghalib : Zati Tasawurat key Ainey Mein) غالب : ذاتی تاثرات کے آئینے میں

A collection of articles in Urdu containing personal impressions of a number of present day writers and poets on Ghalib.

1969, 172 pp.

Edited by Dr. A. Shakoor Ahsan and Syed Sajjad Baqir Rizvi — Rs. 7.00

(Tanqid-i-Ghalib key Sau Sal) تنقید غالب کے سو سال

The book contains a selection of extracts from books and critical articles written on Ghalib in Urdu during the last one hundred years. 1969, 628 pp.

Edited by Sayyid Fayyaz Mahmud and Iqbal Husain — Rs. 19.00

(Ishariyyah-i-Ghalib) اشاریہ غالب

The book contains a detailed index of the works of Ghalib and the books and articles written on the poet. 1969, 490 pp.

Edited by Dr. Muin-ur-Rahman — Rs. 18.00

Ghalib : A Critical Introduction

Written in English the book contains an account of Ghalib's time, life, personality and an assessment of his literary genius.

1969, 518 pp.

By Sayyid Fayyaz Mahmud — (Paper back) Rs. 10.00
(Hand bound) Rs. 20.00

(Qadir Namah) قادر نامہ

It is a small text book in Urdu verse popularly said to have been written by Ghalib in the traditional style for children.

1969, 16 pp.

Edited by Dr. Muhammad Baqir — Rs. 1.75

University Sales Depot
University of the Punjab
Lahore - Pakistan

Dr. Shafi's choice of research items and the line of approach has been dictated by his prepossession for exact historical account. It is, it must be confessed, a dry field and a difficult approach. He started-if I err not, with an index of a big ancient anthology, and his latest gift to the world is an account of great calligraphists of the Moghul period. He is a historian to the core in the orthodox Muslim tradition ; has an uncanny faculty of nosing out material ; is gifted by nature with a lucid, convincing, pleasant style. He crams in his material ; never spins out. I am sure he will not feel offended if I compare Dr. Mohi-ud-Din Zor of the Hyderabad Osmania University with him. Dr. Abdullah, Professor of Urdu at the Punjab University has got his style from Shafi—at least so I think. And there are dozens of other scholars who have benefitted from Shafi's models of accuracy and restraint and counterpoise.

A historical researcher is entitled to esteem, more and more of it, and esteem in plenty Dr. Shafi has had by now—not enough though, in view of the quality and quantity of his work. Sir Abdul Qadir, Dr. Shuja-ud-Din, and Dr. Muhammad Iqbal had very great regard for him. What Europeans thought of his work, such as were competent to adjudge, will be seen from other contributions in this volume. For myself I not only offer him my esteem but also my love today, for the picture that time has left of him in my mind today is that of a true Muslim who is devoted to self-less work, regardless of the fruit of that work to be enjoyed by him. I love him for he is a model of the Gita-ideal of man :

ہوتا ہے جو کوئی مرد شاغل　　بے لوث عمل کی سمت مائل
اس کو ملتی ہے دولت حق　　ہوتا ہے وہ محو ذات مطلق
انساں جو تمام کام اپنے　　ذات مطلق کو نذر کر کے
لاتا نہیں لب پہ اجر کا ذکر　　رکھتا نہیں کچھ مال کی فکر
اس کو نہیں خوف بحر عصیاں　　انساں اک ہے وہ پاک داماں
پتہ نہیں جس طرح کنول کا　　رہ کر پانی میں بھیگ سکتا

(From Gita in Urdu verse by Munawwar Lakhnavi)

nosed out, and what is the type of guidance a senior person can and ought to provide to his proteges ? Most did not impress me. But I noticed that they were going on steadily, and slowly getting the hang of things. A much longer period than the normal one of three years some of them took. *The results—brilliant indeed* ; Principal Shafi can look back with pride on the intuitive rightness of the choice, on his capacity to inspire, and on his power to extract work. A hard task-master, but then in view of our Oriental supineness we need more Shafis.

The Oriental bestows lavish praise, and expects lavish appreciation. Temperamentally sober and self-restrained and trained in the conservative school of Cambridge scholars, Shafi does not permit his judgments of others to be contaminated either by patriotism or religiosity or sheer sentimality ; he is thus not an oriental—at least not a medieval oriental ; if at all an oriental, he is a classicist. You have to compel applause out of him by your extraordinary brilliance. As for his appreciation of his own work by others he would rather the Lord of the Judgment Day himself pronounce upon his merit. Never in his active career has be fished for compliments or arranged for laudatory estimates of his work, as many others have been guilty of. Knowing that he was in the matter of evaluation very balanced, dispassionate and, if I may be pardoned for saying so, abnormally normal, I never presented copies of my published research work to him for I dreaded his unemotionalism, being very oriental myself. But once I could not help taking a copy of my "Urdu Literature" to him for his opinion. I must add that my booklet was more of a creative critical work than a piece of research A week or so later he sent for me and to my greatest surprise he let himself go by saying, I never knew you could let your pen go like that and write so superbly. In the writing of that story of Urdu culture and Urdu literature I had got infected by the late Prof. S. Khuda Bukhsh's enthusiasm for Islamic Culture and its bifurcations. Principal Shafi seemed to me to have revealed another great quality concealed in him—that of reacting emotionally when occasion demanded it. He is just normal, not abnormally normal.